Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies
Vol. 2, No. 3 (April 2023), pp. 30-42
ISSN (Print): 2958-5112
ISSN (Online): 2958-5120
http://www.ipics.rmrpublishers.org
http://journals.rmrpublishers.org/insights-of-pakistan-iran-and-the-caucasus-studies/

اشفاق احمد کے افسانے اور مثالی معاشرہ

Dr. Noureen Khokhar
Associate Professor of Urdu, FC College, Lahore
Dr. Atiq Anwar
Assistant Professor of Urdu, Forman Christian College (Chartered University), Lahore
Dr. Muhammad Tahir Shaheer (Corresponding Author)
Assistant Professor of Urdu, Forman Christian College (Chartered University), Lahore
Email: muhammadtahir@fccollege.edu.pk

Publication History:
Received: March 01, 2023
Revised: March 07, 2023
Accepted: March 13, 2023
Published Online: April 01, 2023

Keywords:
Afsana Nigar,
Gadriya,
Dau ji,
Pandat Ji,
Law of the Jungle,
Poori Jaankari,

Research related to Academic Areas:
Pakistan Studies, Urdu Literature, Languages of Pakistan, Culture of Pakistan,

Acknowledgment:
This paper is a joint academic work of **Authors 01, 02** & **03**.

Ethical Consideration:
This study has no aim to hurt any ideological or social segment but purely based on academic purposes.

Abstract
Society is the name of living together. A healthy and ideal society in which there is no prejudice on the basis of religion, respect for each other's values and traditions, human dignity and the importance of the individual. Ashfaq Ahmed as a famous fiction writer is seen to be constantly trying to make the relationship between the society and the individual healthy with full integrity, courage and responsibility. Ashfaq Ahmed wants to set up an ideal society, where man is aware of his originality and excellence.

Copyright © 2023 IPICS Journal as an academic research-oriented non-profit initiative of Rehmat and Maryam Researches (SMC-Pvt) Limited, publishing from Islamabad, Rawalpindi, and Lodhran under the registration from Security and Exchange Commission of Pakistan (SECP). This is an open-access article. However, its distribution and/or reproduction in any medium is subject to the proper citation of the original work.

انسان ابتدا سے ہی تغیرات کا شکار رہا ہے، جیسے جیسے اپنی زندگی میں آگے بڑھتا گیا، اس کے رہن سہن، رویے اور اخلاق میں تبدیلیاں آتی چلی گئی ہیں۔ انسان کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی بڑی وجہ ارد گرد کا ماحول بھی ہے۔ ہر انسان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش موجود رہتی ہے اور اپنی جان کے لیے وہ لاکھوں پاپڑ بیلتا ہے۔ اپنے آپ کو بہتر ماحول میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی صفات میں سے کچھ انسان کے اندر ڈال کر اس کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک جانور جیسی زندگی گزارنے سے لے کر جب انسان کو تن ڈھانپنے کے لباس، پیٹ بھرنے کے لیے خوراک بھی میسر نہیں تھی انسان نے ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کی ہیں اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہا ہے۔ انسان جیسے جیسے ارتقاء کی جانب بڑھا۔ اسی کے اجتماعی، انفرادی، خاندانی، ذاتی اور معاشرتی تعلقات پیدا ہونے لگے۔ نیکی اور بدی کے تصور نے جنم لیا۔ خیر اور شر میں فرق ہوا، جزا اور سزا کا تصور ابھرا، بے شک اس میں مذہب نے کلیدی کردار ادا کیا، لیکن معاشرے میں صحت مند عناصر کو پیدا کرنے میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے کیونکہ ایک معاشرہ میں تمام افراد کو مل جل کر رہنا ہے اور اس میں ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی تعلقات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس میں ایک ادیب پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ معاشرے میں رہنے والے مختلف افراد میں باہمی یگانگت، محبت اور صحت مند سوچ کو ابھارنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے کیونکہ معاشرہ افراد کے بغیر وجود

میں نہیں آسکتا اس لیے افراد کی صحت مند نشو ونما کے لیے ایسے عناصر کو سامنے لے کر آئے جو افراد میں خرابیاں پیدا کرنے کے باعث ہوتے ہیں تا کہ ان کا سد باب ہو سکے۔ افراد اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی اپنی کتاب ہمارا معاشرہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشرہ کے فرد کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا اس لیے بعض ماہرین معاشرہ کو ایک جسم اور فرد کو اس کے ایک عضو سے تشبیہہ دیتے ہیں، جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام مخصوص طور پر کرنے کے باوجود باہمی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اور مل کر تمام کام سرانجام دیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے افراد اپنے اپنے کام اور باہمی تعلقات سے معاشرے کا نظام قائم رکھتے ہیں۔"(۱)

یہی وجہ ہے کہ فرد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور افسانہ، اردو ادب کی وہ صنف ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کہانی جو کسی واقعہ سے ابھرتی ہے۔ انسان کے گرد ہی بنی جاتی ہے۔ مگر اس کا مرکزی کردار تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ رابرٹ کہتے ہیں:

"Stories happen to people, if there is even a story connected chiefly with a tree, or a stone, or an Ape, the story will exist only because these things will be treated as if they were human rather than as we know they are in nature." (۲)

قدیم دور میں افسانہ سنانا، کہانی سناؤ محض تفریحی مقاصد یا وقت گزارنے کے لیے تھی لیکن آج کے دور میں یہ ایک سنجیدہ صنف ہے۔ لیکن مختصر افسانے کا وجود اس وقت سامنے آیا جب تہذیب کے پنپنا شروع کر دیا۔ انسان کو حقیقی زندگی میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔ معاشرتی اور سماجی زندگی میں الجھنیں بڑھنے لگی۔ نفسیاتی پیچیدگیوں نے جنم لیا تو افسانہ محض تفریحی مقصد کے لیے نہیں بلکہ سنجیدہ اخلاقی فریضے کی صورت میں ڈھل گیا۔ اور سنجیدہ فکری صنف کی صورت اختیار کر گیا۔ ہر سنجیدہ افسانہ نگار جب کہانی لکھتا ہے تو اس کے پیش نظر زندگی کا کوئی نہ کوئی لمحہ فکریہ سامنے ہوتا ہے۔ فرد یا معاشرہ کی کوئی الجھن ہی زیر سطور چھپی ہوتی ہے۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

"افسانہ نگار کا سب سے قیمتی اور سب سے قبل قدر خزانہ اسے مشاہدے کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ آنکھ برابر کھلی رہے تو زندگی میں تخیل اور فکر کے لیے دولت کی کمی نہیں...... افسانہ نگار کو چاہیے کہ وہ برابر اپنے آپ سے اپنی ذات کے متعلق سوالات کرتا رہے۔ ہر انسان ایک سربستہ راز ہے اور رازوں کا کھولنا افسانہ نگار کی دلچسپی کا اہم جزو......"(۳)

اشفاق احمد بھی ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی حیثیت سے پوری دیانتداری، جرأت اور ذمہ داری سے فرد اور معاشرے کے تعلق کو صحت مند بنانے کی مسلسل کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور نہایت سنجیدگی اور فکر کے ساتھ اپنے عہد کے افراد کے ذاتی، اجتماعی، معاشرتی، سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں اور نہایت وضاحت سے فکر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں چھپے جذبات میں احساسات کو سامنے لے کر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں پل بھر کو بھی بند نہیں ہوئی بلکہ وہ معاشرے کو مثالی معاشرے میں ڈھالنے کیلئے کمر باندھ کر تیار کھڑے ہیں۔

معاشرے میں افراد مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ مختلف مذاہب، اقدار اور تہذیب کے لوگوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسرے افراد کو بھی اہم سمجھا جائے اور ان سے بیگانگی اختیار نہ کی جائے۔ ایک ہی معاشرے میں مختلف مذاہب، رسم ورواج اور عقائد سے وابستہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارنا اور دوسروں کی اقدار کو فراموش اور نظر انداز کر دینا صحت مند معاشرے کی نشاندہی نہیں ہے۔ تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

"یہی وجہ ہے کہ ایک صحت مند معاشرہ کسی بھی فرد کو بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اگر کسی معاشرہ کے افراد اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ معاشرہ کے جمود اور اس کی کم مائیگی کی نشانی ہے۔"(۴)

صحت مند اور مثالی معاشرہ جس میں مذاہب کی بناء پر تعصب نہ ہو، ایک دوسرے کی اقدار اور روایات کی پاسداری ہو، انسان کی عزت مقدم ہو، فرد کی اہمیت ہو، کی ایک کڑی اشفاق احمد کا افسانہ "گڈریا" ہے جو اخلاقیات کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ داؤجی کی مذہب اسلام سے عقیدت اور محبت دیدنی ہے۔ اشفاق احمد "گڈریا" میں لکھتے ہیں کہ:

"جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے ولا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔"(۵)

داؤجی اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے، اور آخری عمر تک ان کا شکریہ ہی ادا کرتے رہے۔ عقیدت کا یہ عالم، گولو کے لیے بڑا حیران کن تھا اور وہ اکثر داؤجی سے سوال کرتا کہ آپ اپنے استاد کا اس قدر احترام کیوں کرتے ہیں تو داؤجی جواب میں کہا کرتے تھے کہ:

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

"ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں جس طرف توجہ فرماتے تھے، بندے سے مولا کر دیتے تھے۔"(٦)

مثالی معاشرے کے لیے رشتوں کا احترام بہت اہمیت رکھتا ہے اور اشفاق احمد اس میں استاد اور شاگرد کے حقیقی تعلق اس کی پاکیزگی، گہرائی اور حقیقت سے سب کو روشناس کروانا چاہتے ہیں۔ پورے افسانے میں اشفاق احمد نے خود کو یعنی شاگرد کو کم تر اور استاد کو اس کے ہر رویے، لفظ، عمل سے بلند ترین مقام پر فائز کیا اور جا بجا استاد کے ایثار، محبت، محنت اور قربانی کا ذکر کیا ہے، داؤ جی نے جو محنت اپنے شاگرد کے لیے کی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دنیا میں کوٹھے میں۔ ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتادیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انھوں نے پھر انہی بندوں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جاتا اور جھڑک کر کہتا۔ "مجھے پتہ نہیں، میں نہیں بتاتا تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اترتی جاتی میں آہستہ سے کہتا۔ "داؤ جی"۔

"ہوں" ایک گھمبیر سی آواز آئی۔

"داؤ جی کچھ اور پوچھو"۔

داؤ جی نے کہا، "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔ اس کی ترکیب نحوی کرو۔"(٧)

اشفاق احمد انسان کے انہی تعلقات میں بحالی اور بہتری چاہتے ہیں اور ان روایات کو تازہ کرتے ہیں جو اب غیر اقوام نے اپنا کر ترقی کر لی ہے۔ استاد کا احترام، ہماری اقدار، مذہب اور تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ اس کا اعادہ ضروری ہے اور اس کے افسانے میں جہاں اور بہت سے اخلاقی پیغامات ہیں اور انسان دوستی کی عمدہ مثال ہے وہاں اساتذہ اور طلباء کے لیے بیک وقت مشعل راہ بھی ہے۔

دولت کا خمار، محبت کو روند دیتا ہے۔ دولت معاشرے میں زہر بن کر کیوں اترے، عوام کا معیار زندگی بلند کرنا، ایک ادیب کا اولین ترین فرض ہے۔ اور یہ بات اشفاق احمد بخوبی سمجھتے ہیں۔ دولت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ ہر فرد اپنے آپ کو آرام دینا چاہتا ہے، روپے پیسے کا حصول، یا اس کی خواہش ایسی بھی ناجائز نہیں ہے لیکن ان خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی کی محبت کو قدموں لے روند دینا اپنی خواہشات کے حصول کے لیے دوسروں کی خواہشات کو، دل کو ٹھیس پہنچانا سراسر بے انصافی، خود غرضی اور بے حسی ہے اور انہی رویوں کو بے نقاب کرنا اشفاق احمد اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے افسانے "گل ٹریا" میں مادیت پرستی میں ڈوبے ایسے ہی معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے جہاں جانور اور انسان دونوں برابر ہو جاتے ہیں، پہلے تمامتر دیکھ بھال اور اعتماد کے باوجود گل ٹریا بھاگ جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"بھیا مسکرائے اور زمین پر زنجیر کی کنڈی بٹھاتے ہوئے بولے "کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا اور اگر کوئی زبردستی لے جانا چاہے تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے (٨)"۔

گل ٹریا کے کھو جانے پر نہ تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خود گیا یا کوئی اٹھا کر لے گیا اور نہ کسی کے بھونکنے کی آواز آئی، نہ شور مچانے کی اور نہ ہی پھاڑ کھانے کی کوئی خبر آئی۔ اسی طرح زندگی کے بہت برسوں بعد بھیا کی محبت "ت" بھی ان کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ شادی کر کے چلی جاتی ہے اور اس میں بھی "ت" کی پہلے عین گل ٹریا کی طرح ہی بھیا کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"آج مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کائنات کی سب سے معزز ہستی ہوں۔ جانداروں میں سب سے محترم ہوں۔ میرا جی اپنی عزت آپ کرنے کو چاہتا ہے اور مجھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ایسے لگتا ہے کہ جیسے حضوری کے تمام آداب مجھ میں سمٹ آئے ہو۔ "ت" دوسری لڑکیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ اسے دنیوی مال و دولت اور جاہ و جلال کا ذرا بھی تو پاس نہیں۔"(٩)

اور بعد میں یہی "ت" دولت مند دولہا کے ساتھ شرمائی، لجائی مخصوص لپک کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے اور معاشرے میں بے حسی کا شکار ہونے والے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو تمام معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایسا معاشرہ مادیت کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے اور ان مادیت میں ڈوبے لوگوں کو مرجھائے چہرے اور اداس نظریں دکھائی نہیں دیتیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں دولت کا نشہ چڑھا رہتا ہے اور ان کا ذہن خمار میں ڈوبا رہتا ہے۔ اشفاق احمد ان ہی لوگوں کے رویوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ عام لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

تنکہ میں اشفاق احمد نے روایتی محبت کی کہانی کو انوکھے انداز میں پیش کیا۔ محبت کی ایسی کہانی جس میں روپیہ کی موٹی دیواریں اس میں پنپتی محبت کی جان لے لیتی ہے۔ اس افسانے میں جزئیات کے ساتھ معاشرتی نظام، اخلاقیات اور رسم ورواج کی وضاحت قابل تعریف انداز سے کی گئی ہے۔ داستانوی انداز سے آغاز ہونے والی اس کہانی کا انجام معاشرے کے ننگے سچ پر ہوتا ہے اور مصنف خواب وخیال کی فضا میں نہیں بناتے بلکہ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں تاکہ معاشرے سے اس طبقاتی تقسیم کو ختم کیا جاسکے۔ جہاں ایک پڑھا لکھا نوجوان عزت کا حقدار نہیں بلکہ جہاں عزت کا معیار روپیہ پیسہ ہے۔ مثلاً

سرور نے بلاسوچے سمجھے کہا۔ "چلو ہم ابھی نکاح پڑھوا لیتے ہیں...... عطیہ نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔ "اگر تم بھی بزنس کیا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر تمہارے پاس اتنا ہی روپیہ ہوتا تو ابا جی کبھی انکار نہ کرتے۔" (۱۰)

اشفاق احمد ایسا مثالی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جہاں لوگ ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر بلاوجہ الزام تراشی نہیں کرتے بلکہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاک خانے میں سرور کا زیادہ وقت روپے جمع کرنے، روپے گننے اور روپے بچانے میں گزر جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود پر بھی ایک آنہ خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ مثلاً

"اسے سخت بھوک لگی تھی اور وہ روپیہ بھنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ روپیہ جب بھنوالیا جاتا ہے تو پھر وہ روپیہ نہیں رہتا! وہ اسی طرح اپنے کواٹر میں جا کر لیٹ گیا۔" (۱۱)

ایسے شخص سے اس کے ارد گرد کے لوگ غافل ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ اس کی وجہ تلاش کریں اس کی دلجوئی کریں انسان ہونے کا فرض ادا کریں، اس کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں اور یوں انسان دوستی، محبت اور خلوص سے جذبے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور کوئی شخص بہت ہی اکیلا رہ جاتا ہے۔ مثلاً

"ڈاک خانے کے تینوں ڈاکیے اور بابو محمد دین اسے بے حد کنجوس خیال کرتے تھے اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی برائی کرتے۔" (۱۲)

جبکہ اگر ان چاروں میں سے کوئی سرور کا دوست بن جاتا تو شاید صورتحال مختلف ہوتی اور سرور موت کا شکار ہونے سے بچ جاتا۔ ایک سچے ادیب کی طرح اشفاق احمد معاشرتی اصلاح کے لیے ان سر درویوں کی وضاحت کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے معاشرتی بگاڑ کی بھی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ان میں مثبت تبدیلی پیدا کی جاسکے۔ بہتری کی صورت نکل سکے یا کہ کم از کم یہ شعور ہی ہو سکے کہ نیک وبد میں فرق کیا ہے۔ غریب اور امیر میں فاصلے کتنے ہیں اور کیوں ہیں تاکہ قاری ان فاصلوں کو پاٹنے کی راہ نکال سکے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں کے ذریعے سے ایسے قارئین کو کائنات، انسان اور زبان کی بنیادی حقیقتوں سے روشناس کرواتے ہیں، کہیں ان کا انداز ایک مشفق استاد اور کہیں بے تکلف دوست کا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کا بنیادی مقصد اپنے لوگوں کی اصلاح ہی ہے مثلاً وہ اپنے افسانے "حقیقت نیوش" میں لکھتے ہیں کہ:

"سنو! یہ کائنات نامکمل ہے، انسان نامکمل ہے اور سب سے بڑھ کر اس کی زبان نامکمل ہے۔ اگر سوچنے والے دماغ ہوتے، اگر پر معنی الفاظ ڈھل چکے ہوتے تو جمیل کی زندگی یوں نہ گزرتی۔" (۱۳)

اشفاق احمد کے نزدیک اگر ہم آنے والے برے وقت کے بارے میں پہلے سے اپنے لوگوں کو آگاہ کر دے، اگر آنے والے بلا کے بارے میں پہلے سے علم ہو جائے تو شاید اس ناقابل تلافی نقصان سے بچا جاسکے جو ایک ایک مثالی معاشرے کی تکمیل میں حائل ہے۔

اشفاق احمد ایک ایسا مثالی معاشرہ ترتیب دینا چاہتے ہیں جہاں انسان کو اپنی اصلیت اور فضیلت کے بارے میں آگاہی ہو کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اس بات کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کمزور اور کم ہمت افراد کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور کبھی خود سر اور ضدی لوگوں کے منہ سے کہلواتے ہیں۔ لیکن مقصد وہی ہے کہ مثالی معاشرہ وجود میں آسکے۔ اپنے وجود سے آگاہی حاصل کر سکے۔ اپنی حدود بندی کر سکے مثلاً توشے بلے میں ایک ہی وقت انسان کے اختیار اور بے اختیاری کی حد کا تعین کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"پھر وہ ذرار کی اور دیوار پر نگاہیں جما کر کہنے لگی۔ "میرا اب بھی یہی ایمان ہے کہ انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے، پہاڑوں کے دل چیر دیتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر قوت کو مسخر کر لیتا ہے لیکن جذبہ آفرینش کی رو کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا اور فطرت کے تخلیقی منصوبوں میں دخل نہیں دے سکتا۔" (۱۴)

درج بالا پیراگراف میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کچھ معاملات میں بااختیار ہے اور کچھ میں بالکل بے اختیار۔

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

انسان اگر تقدیر اور تدبیر کی حد بندی کر لے تو اس سے معاشرے کے قوانین کا احترام خود بخود ہونے لگتا ہے۔ پھر فرائض اور حقوق کی حد بندی آسان ہو جاتی ہے۔ نہ کسی شے کی بہتات ہوتی ہے اور نہ کمی اور اسی طرح ایک اچھا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں ہمیشہ معاشرے کے ایسے کرداروں کو ابھارا ہے جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں اور چلتے پھرتے ہمیں نظر آتے ہیں ایسا ہی ایک کردار "صفدر ٹھیلا" میں صفدر کا ہے۔ جو بظاہر بہت غصے والا اور طاقت ور ہے لیکن بطور شاگرد وہ پنڈت جی سے معافی مانگ لیتا ہے۔ مثلاً

"مولوی صاحب ٹھیلے کو کان سے پکڑ کر کشاں کشاں دفتر میں لے جاتے اور پنڈت جی کی میز کے سامنے کھڑا کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہتے "الائق خبیث توبہ کر، معافی مانگ پنڈت جی سے۔ نہیں تو جان سے مار دوں گا۔ اور ٹھیلا ہنستے ہوئے کہتا۔ توبہ جی پنڈت جی جی، معافی دے دو جی۔ اور پنڈت جی معاف کر دیتے۔"(۱۵)

صفدر ٹھیلا جس سے سکول کے سارے لڑکے دبتے تھے اور جو ذرا سے غصے پر کسی کی بھی جان لینے کے درپے ہو جاتا تھا وہ مولوی صاحب کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا اور مولوی صاحب جب تک چاہتے صفدر ٹھیلے کو مارتے مگر وہ چوں تک کرتا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"مولوی صاحب کمزور چرخ ہاتھوں سے صفدر پر قمچیاں برسا رہے تھے۔ ان کا دم پھول چکا تھا اور اب ان سے بات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے چھڑی پیرے پھینک کر کہا۔ زمین پر ناک سے چھ لکیریں نکال۔ ابھی اسی وقت نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔" صفدر ٹھیلے نے فقرہ ختم ہونے سے پہلے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور گراؤنڈ پر ہتھیلیاں جما کر لکیریں نکالنے لگا۔"(۱۶)

اشفاق احمد نے صفدر ٹھیلے کے کردار کے سارے اتار چڑھاؤ کو افسانے میں نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے کیونکہ صفدر ٹھیلا کوئی پلاسٹک یا پتھر کا انسان نہیں بلکہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے جس میں خوبیوں کے ساتھ برائیاں بھی موجود ہیں اور جو کمزوریوں کا بلکہ اخلاقی کمزوریوں کا شکار بھی ہوتا ہے، پستیوں میں بھی اترتا ہے اور اس میں تغیر بھی آتا ہے۔ صفدر ٹھیلا کی جب پنڈت جی سے ان بن ہوتی ہے تو وہ جا بجا ان کو دھمکیاں بھی دیتا ہے۔ مثلاً

"صفدر ٹھیلا نل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آ نکلتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا۔ "اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ پھانسی لگ جاؤں گا پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔"(۱۷)

پنڈت جی جب صفدر ٹھیلے کو سکول سے باہر نکال دیتے ہیں تو وہ اور اس کے دوست یہاں تک اخلاقی تنزلی کا شکار ہوتے ہیں کہ پنڈت جی کی راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان سے بدلہ لینے کی غرض سے برائی کے منصوبے باندھتے ہیں اور پھر کہانی اچانک ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ اور وہی ہوتا ہے جو ہر استاد اپنے شاگرد سے امید کرتا ہے۔ اور صفدر بھی اپنا فرض ادا کرنے سے نہیں چوکتا، اور یہیں سے مثالی معاشرے کا تصور اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب پنڈت جی کی گھوڑی کا پہیہ کیچے میں اتر جاتا ہے۔ تو یہی صفدر ٹھیلا پنڈت جی اور ان کے خاندان کی جان بچانے کے لیے اپنی جان سے گزر جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر کا فخر ایسا ہے کہ اساتذہ برادری کے سارے خلوص اور نیت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اساتذہ ہمیشہ اپنے طلباء کی بہتری کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور بہتری ہی کی امید بھی کرتے ہیں۔ مثلاً

"پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔ "میرا سٹوڈنٹ ہے صفدر...... میرا سٹوڈنٹ...... صفدر میرا سٹوڈنٹ......" اور صفدر گھبرائی ہوئی گھوڑی کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔"(۱۸)

اشفاق احمد ایسا ہی رویہ اور رشتہ استاد اور شاگرد دیکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ شاگردوں کا بھی غصہ وقتی ہوتا ہے اور استاد اور شاگرد بلا تعصب و تخصیص کے ایک دوسرے کے لیے خدمت اور محبت اور حیات کو وقف کر دیتے ہیں۔ صفدر ٹھیلے کا مولوی صاحب کے بجائے پنڈت جی کے لیے جان قربان کر دینا بھی اس بات پر دال ہے۔

اشفاق احمد ایک صحت مند معاشرے کا خواب بنتے ہیں اور اس کے لیے جس بھی سامان کی ضرورت پڑتی ہے وہ اپنے افسانوں کے ذریعے رسد کی صورت عوام تک پہنچاتے ہیں۔ وہ ایسے جہان کے خواہشمند ہیں جہاں محبت ہو، پاکیزگی ہو، امید ہو، تبسم ہو اندھیرے نہ ہو، مایوسی نہ ہو، خوف نہ ہو۔ وہ اپنے افسانے "اجلے پھول" میں بیان کرتے ہیں کہ:

"ہمیں بشاشت کی ضرورت ہے۔ صحت مندانہ پیش قدمی کی حاجت ہے اور کھلاڑیوں جیسی روح کی احتیاج ہے۔ آپ لوگ نوجوان ہیں، صحت مند ہیں۔ اپنے شانوں پر سوچنے سمجھنے والا سر رکھتے ہیں۔ پھر دکھوں کی اندھیر گھپاؤں جھانک جھانک کر کیوں دیکھتے ہیں۔ خوشنما کلیوں کی باتیں کیجیے۔ چاند کی کرنوں سے گیت مرتب کیجیے۔ افقی ستارے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایئے...... اگر ایسا نہ ہو گا تو زندگی بے حد تلخ فرض ہو کے رہ جائے گی اور مستقبل حال بننے سے آسیب زدہ خرام نظر آئے گا۔"(۱۹)

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

یعنی ایسا معاشرہ جہاں مایوسی، غم اور اداسی کے اندھیرے نہ ہوں بلکہ روشن، شیتل اور پر سکون حال ہوں اور ایسا ایسی صورت میں ہی ممکن ہے جب ذہن و دل سے اچھی باتیں نکلیں۔ کیونکہ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"انجم بھائی نے کہا" اچھی اچھی باتیں سوچنے سے اچھے اچھے کام آپ سے آپ ہو جایا کرتے ہیں۔"(۲۰)

اشفاق احمد کے نزدیک ہمت سے انسان اپنے ارد گرد کے ماحول کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اپنے حال اور مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ حالات کا رخ بدل سکتا ہے۔ مثلاً

"گاڑی چلنے لگی تو انجم بھیانے کہا۔ طلوِ دامن کیساہی کیوں نہ ہو، انھیں کلیوں سے سجانا تمہارا کام ہے۔ مقدر (اگر کوئی چیز مقدر ہے تو) کیسا بھی تاریک کیوں نہ ہوں، ہمت عالی سے منور کیا جا سکتا ہے۔ چاند نکلتا ہے تو اس کی کرنیں بلا قیمت میسر آتی ہیں لیکن انھیں مہیا کرنا اور سنہرا مستقبل وضع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔"(۲۱)

اور انجم بھائی کا یہی اعتماد آگے چل کر سچ نکلتا ہے۔ اشفاق احمد قارئین کے دل سے کم ہمتی ختم کر کے انھیں اعتماد اور عالی ہمتی کا درس دیتے ہیں تاکہ مستقبل کی راہیں اجلی اجلی کرنوں سے منور ہو سکیں۔

قانون کسی بھی قوم کی آزادی کا علمبردار ہوتا ہے۔ قانون کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے تاکہ معاشرے میں توازن برقرار رکھا جاسکے۔ جس معاشرے میں قانون کی پاسداری نہ کی جائے وہاں کے افراد پر زندگی تنگ ہو جاتی ہے اور توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کھلے بندوں قانون کو توڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور انصاف ختم ہو جاتا ہے۔ جب انصاف ختم ہو جاتا ہے تو معاشرہ بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

"چنانچہ اگر قوانین کو اٹھا دیا جائے تو انسان او حیوان میں بہت کم فرق رہ جائے اور مختلف نظام انتشار میں مبتلا ہو کر ایسا ماحول پیدا کر دیں جسے جنگل کا قانون (Law of the Jungle) کہا جا سکتا ہے۔"(۲۲)

جس معاشرے میں قانون مضبوط ہو اور اس کی اساس انصاف پر ہو وہاں جانوروں اور مشینوں کو انصاف کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی، معاشرے میں غیر مہذب روایات جنم نہیں لیتی اور زندگیاں عذاب میں مبتلا نہیں ہوتیں۔ مثلاً اشفاق احمد کے افسانے قصاص میں ہے کہ کرتارے کو جب قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے قاتل آرام سے قانون کی نظروں سے بچ نکلتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"سابو نے کہا" بڑا لمبا مقدمہ چلا۔ بے بے نے پورا رقبہ بیچ کر بیٹے کے قاتلوں کی ساری گردنیں پھندوں میں پھنسا دیں لیکن پانچ صاف بری ہو گئے اور چھٹے کو شسشن بول گئی۔ وہ بھی ہائیکورٹ میں بری ہو گیا۔"(۲۳)

جس معاشرے میں برائی کی سزا دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہاں قانون کا احترام بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہاں آس، امید ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح سابو، دینو اور بردے کے قتل کے بعد اس کے قاتل آرام سے لینڈ روور کے پاس آجاتے ہیں اور اس کا جائزہ لینے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ سپاہی وہاں موجود نہ تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

"انھوں نے موقعے پر موجود محافظ سنتری سے پوچھا تو اس نے قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، صرف ایک پیالی چائے پینے گیا تھا اور اسی عرصے میں سارا کھیل ہو گیا۔"(۲۴)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں اس حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ کائنات میں تمام کام قانون قدرت کے مطابق جاری وساری رہتے ہیں اور یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کائنات کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات اپنے اپنے کردار نبھانے میں مصروف ہے وہ اپنے افسانے "ملک الموت" میں بیان کرتے ہیں کہ:

"ہر کام کے لیے وقت اور مقام طے ہوتا ہے۔"(۲۵)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں بتاتے ہیں کہ اگر رشوت، منافع خوری اور بددیانتی اس قدر عام ہو جائے کہ آپ کے اپنے گھر کے افراد بھی اس میں ملوث ہو جائیں تو کیا آپ خاموش ہو جائیں گے، بے بس ہو کر تماشا دیکھیں گے نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ہماری روایات کا حصہ نہیں ہے۔ ہم ایک زندہ قوم ہیں ہماری روایات اور اقدار ہیں، ظالم کے خلاف احتجاج کا رویہ شامل ہے جیسا کہ "سعید جونیئر" میں سعید احمد کی ماں کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بیٹا رشوت خور ہے تو وہ اس سے الگ ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

"سعید کی والدہ نے پہلے تو اس سے برتن علیحدہ کیے پھر خود اس سے علیحدہ ہو کر درزیوں کی کٹڑی میں چلی گئی۔"(۲۶)

کیونکہ اس کی ماں کی تمام عمر دیانت داری سے گزری تھی اور رزق حلال پر اس کا ایمان تھا۔ اس لیے اس کی والدہ نے سعید احمد کے تمام عیش و آرام پر لات مار دی اور الگ جا کر رہنے لگی۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں مشرقی عورتوں کی اقدار کا ذکر بھی کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"پرانے زمانے کی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ قدروں کی بھی پالن ہار تھیں۔ مردوں کی بے راہ روی میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیتی...... معاشرتی اقدار کے معاملے میں ان کے گھروں کی قلعہ بندیاں بڑی مضبوط تھیں اور ساری بستیاں انہی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ پرانی عورتیں اقدار کی محافظ تھیں اس لیے اپنے فیصلوں میں بڑی آزاد تھیں۔"(۲۷)

بے راہ روی، اقدار کی پامالی کے خلاف ایسا ہی رویہ اشفاق احمد سب میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کا علم عورتوں کے ہاتھوں میں پکڑا کر اس بات کا اعادہ کرواتے ہیں کہ تم اقدار کی پاسبان ہو، تم اپنے چلن کو مت چھوڑنا اور بے خوف ہو کر دلیری کے ساتھ ہر گھر میں ان برائیوں کے خلاف جنگ لڑنا تبھی مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

اشفاق احمد ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جس میں سب ایک دوسرے سے محبت سے پیش آئیں۔ روایات کا پاس ہو، دکھ درد کا احساس ہو اور ان وقتوں کی یاد دلاتے ہیں جن میں تمام لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ میں بیان کرتے ہیں کہ:

"پہلے وقتوں میں جب دو ستارے ٹکرا جاتے تھے تو مہینہ مہینہ بھر ستاروں میں روشنی نہیں رہتی تھی، کسی کے ہاں چراغ تک نہیں جلتا تھا لیکن اب کہکشائیں ٹکرا جاتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔"(۲۸)

اشفاق احمد اپنی چشم تخیل سے ایک ایسا معاشرہ دیکھتے اور دکھاتے ہیں جہاں ہر طرف امن ہو اور تعلیم، فلسفے، قاعدے قانون سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود کسی کو کوئی بات بتانی یا سمجھانی نہ پڑے بلکہ ہر شخص اپنی سطح پر ہو اور ہر بات کا علم رکھتا ہو، کوئی سوال جواب نہ ہوں، کسی بات کے بارے میں ابہام نہ ہو، ہر طرف خوشحالی ہو اور لوگ غیر معمولی طور پر حکمت اور دانش سے معمور ہوں اس سلسلے میں اپنے افسانے "پوری جان کاری" میں لکھتے ہیں کہ:

"ماہڑا ایک ترقی یافتہ شہر تھا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ یہاں کے بہت کم لوگ ہسٹری، فلسفے، الہیات اور قانون سے واقف تھے، ماہڑا کے باشندے کم آمیز، کم کوش، اور کم سخن تھے اور ان کے درمیان کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں ہر بات کو سمجھنے، پرکھنے اور اختیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔"(۲۹)

اشفاق احمد اپنے افسانے "پوری جان کاری" میں ایک ایسا معاشرہ دکھاتے ہیں جہاں لوگ لڑنے جھگڑنے سے ناواقف تھے اور پیار محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسا ہی معاشرہ اشفاق احمد کا بھی خواب تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ماہڑا کا معاشرہ وہ خوش قسمت معاشرہ تھا جس کے ہر فرد کو ہر چیز معلوم تھی اور ان کے درمیان کبھی مناظرہ، مکالمہ مجادلہ یا مباہلہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑنے جھگڑنے کے فن سے نا آشنا تھے اور محبت اور یگانگت کی خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔"(۳۰)

ایسے خوش قسمت معاشرے کی وجہ اشفاق احمد "علم" کا حصول گردانتے ہیں کہ علم کی روشنی سے ذہن و دل منور ہوتے ہیں اور صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

"بچے بھی سب کچھ جانتے تھے، عورتیں بھی جانتی تھیں، بڈھے بابے بھی آگاہی کی بیساکھیوں پر پڑے جھولتے تھے۔ ہر طرف جان کاری ہی جان کاری تھی۔ چنانچہ ہر شخص علم کی ڈور میں لپٹا ہوا تھا اور علم ہی ان کی واحد میراث تھی۔"(۳۱)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"وہ لوگ علم کی ایسی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے درمیان کسی قسم کی منافقت، پرخاش یا کھٹا پٹی باقی نہیں رہی تھی۔"(۳۲)

اشفاق احمد ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں نہ صرف ملک کے اندر امن و سکون کی فضا ہو بلکہ بیرونی طور پر بھی ملک ساری آفتوں سے محفوظ ہو جہاں کسی بھی قسم کا کوئی خلا نہ ہو نہ کوئی خطرہ ہو اسی قسم کے ایک ستارے کو انھوں نے پالیا تھا اور اس کی تصویر اپنے قارئین کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ:

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

رعنا نے کہا، سر ہمارا ستارہ ایسے محفوظ مقام پر واقع ہے کہ وہاں نہ تو اسے کسی بلیک ہول کا خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی اس کے قریب کوار کس کی آبادی ہے۔ بس سکون ہی سکون ہے، محبت ہی محبت ہے۔(۳۳)

ایسا معاشرہ، ایسا جہان، ایسا ستارہ جہاں کوئی بگاڑ نہ ہوں اخلاقی برائیاں نہ ہوں، شرارت کی قوتیں نہ ہوں، بدی کے اثرات نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ جہاں ابلیسی طاقتیں پر مارنے کی طاقت نہ رکھتی ہوں۔ مثلاً قلارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس ستارے کی ساخت میں اور ساری کیاں تو ہماری زمین جیسی ہیں لیکن اس میں تکبر اور انانیت کا جزو شامل نہیں ہے اور جس بنتر اور بناوٹ میں اشکبار کے اجزا شامل نہ ہوں وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہوتا اور وہاں ابلیس کا اغوا ممکن نہیں رہتا۔ اور جو علاقہ شیطان اور اس کے لشکر کی دسترس میں نہ ہو، وہاں خواہشات نفسانی کی ساری ڈبیاں بھی کھل جائیں تو وہ خالی ہی رہتی ہیں۔ اصل میں ان کو آگ دکھانے والا اور شعلہ بھڑکانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔"(۳۴)

یعنی جہاں نفرت، کدورت، حقارت اور غرور تکبر نہیں ہوتے وہاں شیطان کے سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں اور وہاں انسان کا نفس بے قابو نہیں ہوتا کیونکہ یہ نفسانی خواہشیں ماحول پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ماحول اور محرک کے اثرات تو بلبلے پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں، بنتا بھی ماحول کے دباؤ سے ہے اور ٹوٹتا بھی اسی کی تحریک پر ہے۔"(۳۵)

اس لیے صحت مند معاشرے کے لیے ماحول کا بہتر ہونا بھی لازمی عنصر ہے۔ صحت مند ماحول سے جانور بھی انسانی صفات کا حامل ہو سکتا ہے اور بلند ترین مقام کو چھو سکتا ہے۔ مثلاً ''بولتا بندر'' میں ملاحظہ فرمایئے:

"جس طرح ان کے آباؤاجداد ارتقاء کے زور پر بندر سے انسان بن گئے، ایک روز یہ بھی بندر نہیں رہیں گے اور انسانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔"(۳۶)

اشفاق احمد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی طرف ہمیں لے کر چلتے ہیں جہاں ہم اپنی کوشش اور ہمت سے حالات سے لڑ کر ان کو تبدیل کر سکتے ہیں جیسے کہ ان کے افسانے ''سلامتے کی مار'' اس کی واضح مثال ہے۔ جب سلامتے کو اس کا باپ گاموں چوہدری کے ساتھ رخصت کر دیتا ہے تو وہ ہتھیار نہیں ڈال دیتی بلکہ چوہدری کو مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ جب گلو چوہدری کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر گاموں کو بلانے کے لیے دوڑتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ:

"گاموں بولیا، ہن میں کی کراں۔ اوس سور کی بچی نے ہتھ ای ایسا پایا ہیگا کہ بندا ہل نئیں سکدا۔ یاں مر گیا یا توبہ تلا کر کے چھٹ گیا۔ بول میں کی کراں۔ بھلا میں کی پتہ سی اوہ ایسی زہری ہنگی۔ باہروں بالکل ملوک بالکل ساؤ۔ اندروں ایسی کپتی۔ میرے آکھیاں اوس چھڈ تھوڑی دینا ہیگا چوہدری کوں۔ دعا کرو۔ نال منت خوشامد کرو۔ چوہدری وی بچ جائے۔ گامو وی بچ جائے۔ بڑا بھاری مقدمہ بن سکدا ہیگا۔ میرے پورے ٹبر تے۔ آل اولا دتے۔ ''گلو ایہہ گل سن کے رولا پاتا، حال دھائی مچاتا پھیر حویلی کی طرف نس گیا پر گاموں اپنی تھاں تے اسی طرح بیٹھا رہیا۔"(۳۷)

گاموں تسلی سے بیٹھا رہتا ہے کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ بھی اس بے جوڑ رشتے کے خلاف تھا اور رخصتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چوہدری کے آگے بے بس ہو کر اس نے اپنی بیٹی کی رخصتی کی تھی۔ سلامتے نے چوہدری کے ظلم کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اس کی جان مشکل کر دی کہ وہ بلبلا اٹھا۔ اشفاق احمد ایسا ہی معاشرہ چاہتے ہیں جہاں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے، جہاں امیر کو اس کے ظلم کا مزا چکھایا جائے۔ جیسا کہ ان کے افسانے ''ننگ ناموس'' میں دارے لوہار نے ملک کے ساتھ اپنی بیوی کے یارانے کا بدلہ کچھ اس طرح سے لیا، اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"پر نالے کے ساتھ لگے لگے دارے کو شام کو واقعہ یاد آ گیا۔ مزارع دھاڑیں مار رہا تھا اور ملک کہہ رہا تھا یہ کتی نہیں میری دھی ہے۔ میری ننگ ناموس ہے۔ دار انشے میں سوچ رہا تھا پستول چلے گا تو دونوں مر جائیں گے۔ دونوں ختم ہو جائیں گے پر ملک کی عزت میں فرق نہ آئے گا ملک زندہ بھی ملک تھا اور مر کر بھی ملک ہی رہے گا۔ اس نے اپنی ڈب میں پستول کو اچھی طرح سے لپیٹ کر تہمد میں اڑس لیا اور دیوار کے نال نال چلتا ہوا مسلیوں کے ڈیرے پہنچ گیا۔ سیٹی بجا کر اور پچکار پچکار کر وہ اسے اپنے ساتھ نالے کے اس لے آیا اور پھر ایک دم مسلیوں کے ڈبو کو گودی میں اٹھا کر ملک کے احاطے کے اندر سٹ دیا جہاں بہار پر آئی ہوئی رانی فریادیں کر رہی تھی۔"(۳۸)

ایسا معاشرہ جہاں غریب بھی ذہانت کا استعمال کر کے انتقام کا منصوبہ عقل مندی سے بنا سکتا ہے اور اس کو عملی جامہ بھی پہناتا ہے تاکہ ایسے ملک لوگوں کو نصیحت ہو سکے وہ بھی اس کرب سے گزر سکیں جس سے دارا گزرا تھا جب اسے پتہ چلا تھا کہ ملک کے ساتھ اس کی بیوی کا یارانہ ہے۔

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں برے کام کا برا نتیجہ ہی دکھاتے ہیں کہ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ یہ اصلاحی سبق دے کر وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر اپنی نسلوں کو بقا چاہتے ہو تو خود کو درست رہنا پڑے گا۔ ان معاشرتی رویوں کو بے نقاب کر کے اور برائیوں کا نتیجہ پڑھ کر ہی ان سے اجتناب کیا جائے تا کہ اچھا اور صحت مند معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔ جیسا کہ چوہدری تفیرے کی بچھیری اس کی اور اس کے بیٹے کی لاپرواہی کی وجہ سے کھو جاتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ:

"چوہدری تفیرے نے جل کر کہا، لکھ لعنت ہے تیری جوانی پر اور تیرے پیدا ہونے والے دن پر۔ پتہ نہیں کہاں کہاں خوار ہوتا پھرا ہے۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں خود جا کر بچھیری کھیت سے لے آتا...... جا دفع ہو جا میری آنکھوں کے آگے سے۔ پتہ نہیں کدھر کدھر بے حیائیاں کرتے پھرتے ہیں اور جانور بے آسرا چھوڑ کے خدا خیر کدھر منہ کالا کرتے ہیں۔"(۳۹)

حالانکہ دونوں ایک ہی جیسی برائی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس لیے خدا بھی ان کی بچھیری کی حفاظت نہیں کرتا۔

اشفاق احمد ایک ایسے گھرانے کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں جہاں میاں بیوی وفاداری سے اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک پر سکون گھرانہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"تھوڑی دیر بچھوں رسولاں پولے پولے قدم دھرتی کوٹھے اندر گئی پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ دونوں شکاری اور شیر ایک دوسرے کے گلے میں باہاں ڈال کے گھوک سوئے ہوئے پڑے تھے۔ منجی چھوٹی تھی۔ شیر کا سر اور پنجے سیر وا اور پائنتی سے باہر نکلتے ہوئے تھے اور پگڑی بھوئیں نے کھلی پڑی تھی۔"(۴۰)

اشفاق احمد کے نزدیک اگر اسی گھرانے کی طرح اپنے ملک، قوم، کام، زمین کے ساتھ وفادار رہا جائے تو پورا معاشرہ مثالی بن سکتا ہے۔ کیونکہ محبت ہی واحد شے ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک گھر سے ملک تک کو خوش مطمئن اور پر سکون رکھا جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں ایسے مثالی معاشرے کا نقشہ کھینچتے ہیں جہاں انسان انسان سے محبت تو کیا، جانوروں کے لیے بھی اپنی جان کی بازی لگانے سے دریغ نہی کرتا۔ جس طرح "بابا" افسانے میں بابا کی بہو ایلن بچھڑے کو آزاد کروانے کے لیے خود کو منہ زور پانیوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"ایلن کمبل پرے پھینک کر اصطبل سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے بابا کی دو تین آوازیں گونجیں لیکن وہ طوفانی رات کے اندھیارے سینے میں گھستی چلی گئی۔ چتلی اب بھی ڈکرا رہی تھی اور ایلن کو پانی میں تیرتے دیکھ کر اس کی آواز میں اور کرب پیدا ہو گیا تھا۔ بارش کی شدت کم نہ ہوئی تھی اور پانی سمندری لہروں کی طرح امڈا تا چلا آ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات میں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ وہ اندازے لگاتی عین اس جگہ پہنچ گئی جہاں بہت سے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے زور سے پاؤں مارا تو اس کا پنجہ بچھڑے کی تھوتھنی پر لگا۔ وہیں سے غوطہ لگا کر وہ کھونٹے تک پہنچ گئی مگر زنجیر نہ کھول سکی۔ دوسری مرتبہ زیادہ گہری ڈبکی مار کر اس نے پانی کے اندر ہی اندر زنجیر کھولی اور بچھڑے کو آزاد کر دیا۔"(۴۱)

وار ایلن اس طوفانی بارش میں بچھڑے کو بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد چاہتے ہیں کہ یہ احساس نہ صرف انسانوں کی آپس میں محبت پیدا ہو بلکہ جانوروں کے لیے بھی ہمدردی رکھتا ہو۔ کیونکہ جو انسان انسان سے محبت رکھتا ہو اس کے دل میں ہی ہمدردی کے جذبات ہو سکتے ہیں جو درد مند دل رکھتا ہو وہ ہی تڑپ کر ایک جانور کے لیے پانی میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔

شفاق احمد اپنے افسانوں میں حکومتی سطح پر بھی کچھ تبدیلیاں لانے کے مشورے دیتے نظر آتے ہیں کہ ان جزئیات پر کام کر کے معاشرے میں تندرست افراد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ "گداگری" باقاعدہ پیشے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اشفاق احمد کا خیال ہے کہ اگر حکومت ذرا سا غور فرمائے تو اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ نہ کہ ان کو سزا کے طور پر جیل خانوں میں بند کیا جائے بلکہ ان کو اگر روزگار فراہم کیا جائے یا ان کو ہنر سکھایا جائے تو معاشرے میں اچھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے افسانے "فل برائٹ" میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں نے کہا اس کے کندھوں کی ہڈیاں نہیں دیکھیں آپ نے ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی کمبخت کی۔ حکومت انھیں گرفتار کرنے کے بجائے ان کی روٹی پانی کا بندوبست کرے۔ انھیں کام مہیا کر کے دے تو ایک بات بھی ہو۔ یہ کیا کہ ادھر ادھر سے پکڑ کر ٹرکوں میں بٹھایا اور لے جا کر بندی خانے میں دے دیا۔ اچھے بھلے آدمی کو جرائم پیشہ لوگوں کے حوالے کر دیا۔"(۴۲)

شفاق احمد نہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان ہاتھ پھیلانے والے ہاتھوں کو ہنر مند ہاتھوں میں تبدیل کر دیا جائے اور حکومت اس کے لیے کوئی عملی اقدام اٹھائے بلکہ وہ اس بات کو بھی ختم کرنے کے حق میں ہے کہ ان فقیروں کو جرائم پیشہ افراد میں شمار کرنا ان کے ساتھ نہ صرف زیادتی ہے بلکہ سراسر ظلم ہے۔ اشفاق کے خیال میں اگر ان ہاتھوں کو ہنر بخشا جائے ان کو کام دیا جائے تو یہ ہرگز کسی کے سامنے نہیں پھیلیں گے۔ اشفاق احمد ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں انسانیت کی تذلیل ہونہ ہو برابری کی سطح پر مساوات کے ساتھ زندگی گزاری جائے اور ایک دوسرے کے مسائل کا حل خوب سوچ سمجھ کر مثبت انداز میں کیا جائے۔ معاشرے سے گداگری جیسے پیشوں کا قلع قمع مثبت بنیادوں پر کیا جائے سزا کے ذریعے نہیں بلکہ حل نکال کر مسائل کا خاتمہ ہو نہ کہ ان کو عارضی طور پر دبا دیا جائے۔

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

شفاق اپنے افسانوں میں اپنے لوگوں کو ایسی سوچ عطا کرتے ہیں جس کو اپنا کر ہمارا شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہو سکتا ہے۔ وہ موجودہ معاشرتی صورتحال سے مایوس نہیں ہیں اور نہ ہی حالات کا ذمہ دار کسی ایک شے کو ٹھہرا کر کوستے نظر آتے ہیں بلکہ وہ آگے کی طرف چلنے کے لیے راہوں کو روشن کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"کوشش اور سعی مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسان حیات ارضی میں آفتاب جہاں تاب بن کر دمکتا ہے۔"(۴۳)

اور آگے بڑھنے کے لیے مثالی صورتحال پیدا کرنے کے لیے چند مشورے بھی دیتے نظر آتے ہیں تاکہ ملک کو ترقی کا گہوارہ بنا کر کامیاب معاشرہ تشکیل دیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو، انھوں نے محنت کی ہے، مشقت جھیلی ہے۔ بے میرٹ لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو، اس ملک سے دفع کرو۔ وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔"(۴۴)

اس لیے ہنر مند لوگوں کی عزت کی جائے اور بے ہنر لوگوں کو پیچھے کیا جائے تاکہ ملک کی ڈور ہنر مند، سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ ایسا معاشرہ تعمیر کیا جائے جہاں آرٹسٹ، فنکاروں اور تخلیق کاروں کی عزت ہو۔ کیونکہ فنکار معاشرے کو اپنے فن کے ذریعے سے جس طرح محظوظ کرتا ہے اور سوچ کے نئے در وا کرتا ہے معاشرے کا فرض ہے کہ اس کی عزت کرے اور اس کا اصل مقام اسے دے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"فن کار ایک انسان، ایک شخص یا ایک فرد نہیں ہوتا، وہ ایک مکتبہ فکر، ایک سکول آف تھاٹ ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے کو اچھا وقت دیا ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے پر کچھ احسانات کیے ہوتے ہیں اور ان احسانات کا بدلہ چکانا معاشرے کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔"(۴۵)

اشفاق احمد ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں شاعروں اور ادیبوں کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ انھیں باعزت طریقے سے سراہا جائے، ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ادیبوں اور شاعروں کا کوئی مقام ہے اس جگہ۔ کوئی ان کے لیے اچھی نوکریاں یا اچھے رستے یا پلاٹ اور پنشن ہیں کہ معاشرے میں ان کا مقام ہو، ان کی بات سنی جائے، ان پر توجہ دی جائے۔"(۴۶)

تاکہ ایک فنکار کی معاشرے میں عزت ہو اور وہ دوسروں کے لیے حقوق کے لیے اپنے قلم کو اٹھا سکیں اور عوام کے مسائل کے لیے آواز بلند کر سکیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اپنی زندگی اور مستقبل محفوظ ہوں تاکہ وہ منفی رجحانات کی طرف قدم نہ بڑھائیں، بلکہ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"آپ ادیب اور شاعر اور نقاد اور دوسرے دانشور اپنے قلم کو ہماری سہائتا اور رکھشا کے لیے استعمال کریں اور ہمارا حق ہمیں دلوائیں۔"(۴۷)

ایک ادیب اور شاعر سے یہی امید رکھی جائیں کہ اس کا قلم جب بھی اٹھے گا عوام کے مسائل کی نشاندہی اور حقوق کے لیے بلند ہو گا کیونکہ ساری کائنات خدا تعالیٰ کی بے مثال فن کی صناعی ہی تو ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"انسان عظیم ہے خدایا، اور میں لافنا ہوں کہ میرا فن امر ہے اور فن زندگی ہے، فن حیات ہے، فن شکتی ہے، اور اس ساری کائنات کا مدار فن پر ہے اور ساری تخلیق فن کی لیلا ہے اور فن آرٹسٹ کے ہاتھ کا مرہون منت ہے، انسان کے ہاتھ کا دست نگر ہے اور انسان بہت بڑا ہے......اس پوری کائنات سے بڑا اور اس ہر لحہ پھیلتی ہوئی کائنات سے اور بھی بڑا۔"(۴۸)

اشفاق احمد جہاں انسان کی عزت اس کے فن کی قدر دانی کرنے والے معاشرے کو اپنی چشم تخیل سے دیکھتے ہیں وہاں ایسے آرٹسٹ، بے دھڑک، شفاف انسانوں کے بھی طلب گار ہیں جو آگے بڑھ کر ان خوابوں کو تعبیر دے سکیں۔ کم حوصلہ اور بے زبان لوگوں کا حوصلہ اور زبان بن سکیں۔ مثلاً ڈھور ڈنگر کی واپسی میں نائیلہ گاؤں میں آکر وہاں کی بے بس عورتوں کی زبان بن گئی۔ ملاحظہ فرمایئے:

"گاؤں کی عورتیں کیا بڑی بوڑھیاں، کیا جوان لڑکیاں اور کیا نوخیز چھوکریاں سبھی نائلہ کی عاشق ہو گئی تھیں، جن باتوں کا اظہار مردوں کے منہ پر کرنے سے وہ ڈرتی تھیں اور جن باتوں کو ایک مرتبہ کر دینے کی حسرت لے کر ان کی مائیں، ماسیاں اور دادی نانیاں قبروں میں چلی گئی تھیں، وہ باتیں نائلہ پھٹاک دے کر بڑے بزرگوں کے منہ پر دے مارتی تھی اور ارد گرد دور دور تک پھیلی عورتوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان کے ہر دے دیر تک تالیاں بجاتے رہتے تھے اور ان کی کوکھیں ہر ہر جنبش کے ساتھ نعرے مارتی چلی جاتی تھیں۔"(۴۹)

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

اشفاق احمد کے خیال میں برے حالات کو اچھے میں بدلنے کے لیے کسی نہ کسی کو مسیحا بن کر میدان میں اترنا پڑتا ہے اور کوشش کر کے صدیوں کی گھٹن کو دور کیا جاسکتا ہے۔ تبھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ایک مشن کا ہونا ضروری ہے تا کہ ایک مقصد کے تحت اپنی کوششوں کو بروئے کار لا کر مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔ جیسا کہ ''ڈھور ڈنگر کی واپسی'' میں نائلہ کا ایک مشن تھا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے صدیوں پرانی گھٹن دور کر کے انھیں پاک صاف کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ذہن سے وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام کے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تانے تھے۔ وہ شفاف ذہن، شفاف بدن، شفاف الیکشن اور شفاف سودے کی قائل تھی۔ وہ ایسی غلط ملط غلطیاں قسم کی زندگی کے بے حد خلاف تھی جس میں انسان ساری زندگی ٹوٹتا تڑپتا ہی رہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔"(۵۰)

ایسا معاشرہ جس میں صاف ستھرے لوگ نیک نیتی کے ساتھ سامنے آکر معاشرے میں مثبت انقلاب لا سکیں۔ انسانوں کو بہتری کی طرف لے جانے کی کوشش کر سکیں، بغیر کسی لوبھ لگن اور لالچ کے صرف انسانیت کی فلاح ہی مقصد ہو۔ ایسا معاشرہ جہاں انسان آزادی رائے رکھتا ہو اور اسے اپنا حق مانگنے اور چھوڑنے دونوں کی آزادی ہو۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"ماسٹر عبدالودود نے کہا، دلبر شاہ صاحب مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بے شک رائٹس مانگنے کے لیے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو رائٹس مانگنے کا پورا پورا حق ہے، لیکن اگر کوئی اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو اتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ سکے اور بلا جبر و اکراہ چھوڑ سکے۔ اس پر پابندی تو نہیں ہونی چاہیے۔"(۵۱)

ایسا معاشرہ جہاں آزادی فکر کے عملی اظہار کو بے وقوفی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو سراہا جائے اور عزت سے نوازا جائے جہاں امیر غریب سب برابری کی سطح پر ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ طبقاتی تفریق ختم ہو کر رہ جائے۔ اشفاق احمد ایسے ہی تصوراتی معاشرے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہمارا کلچر پیٹرن کتنی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ابرار اب مزدور لوگ بھی کیک کاٹ کر اپنے بچوں کی سالگرہیں منانے لگے ہیں۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔"(۵۲)

ایسا معاشرہ جہاں بغیر حسد اور جلن کے اپنے سے نچلے طبقے کے لوگوں کی خوشیوں کا احساس کر کے ان کو تسلیم کیا جا سکے اور ان کو مان اور عزت دی جائے۔ اشفاق احمد اپنے افسانوں میں مثالی معاشرے کا ایسا اسکیچ پیش کرتے ہیں جس پر مثبت سوچ کی تعمیر سے درخشاں مستقبل کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ وہ تمام عمر دنیا و آخرت کی فکر میں نہ صرف خود رہے بلکہ اپنے قارئین اور ناظرین کو بھی رکھا۔ اس لیے ان کے مثالی معاشرے میں مثالی انسان کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں معاشرے میں موجود ہر فرد کی زندگی اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ موجود ہے اور وہ فرد اور معاشرے کے تعلق کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہتر بنانے کی ہر کوشش میں مکمل کامیاب نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ تجمل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ'' لاہور، ابلاغ پبلشرز، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹

۲۔ 13Robert Boynlon "Introduction to the short story" Haydon Book Company, U.S.A 1978, Page

۳۔ وقار عظیم، پروفیسر ''فن اور افسانہ نگاری'' ادارہ اشاعت اردو، کراچی، طبع اول اکتوبر ۱۹۴۹، ص ۲۵

۴۔ تجمل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ'' ابلاغ پبلشرز اردو بازار، لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۷۳، ص ۲۲

۵۔ اشفاق احمد ''گڈریا'' مشمولہ: ''جلے پھول۔ گڈریا''، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔ ص ۱۳

۶۔ ایضاً۔ ص ۲۸

۷۔ ایضاً۔ ص ۲۰

۸۔ ایضاً ''گل ثریا''، ص ۵۴

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

۹۔ ایضاً ''گل ٹریا''، ص۶۰

۱۰۔ ایضاً ''تنکہ ''۔ ص۷۰

۱۱۔ ایضاً ''تنکہ ''۔ ص۷۲

۱۲۔ ایضاً ''تنکہ ''، ص۷۲

۱۳۔ ایضاً ''حقیقت نیوش ''۔ ص۷۹

۱۴۔ ایضاً ''توشے بلے ''۔ ص۹۷

۱۵۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا ''۔ ص۱۰۰

۱۶۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا ''۔ ص۱۰۱

۱۷۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا ''۔ ص۱۰۳

۱۸۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا ''۔ ص۱۰۷

۱۹۔ ایضاً ''اُجلے پھول ''۔ ص۱۲۰

۲۰۔ ایضاً ''اُجلے پھول ''۔ ص۱۲۱

۲۱۔ ایضاً ''اُجلے پھول ''۔ ص۱۲۲

۲۲۔ تجمل حسین ہاشمی، ہمارا معاشرہ، ابلاغ پبلشرز اردو بازار، لاہور، جنوری ۱۹۷۳، ص۹۵

۲۳۔ اشفاق احمد، ''قصاص ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵

۲۵۔ اشفاق احمد، ''ملک مروت ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۷

۲۶۔ اشفاق احمد، ''سعید جونیئر ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۵۱

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ اشفاق احمد، ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۷۱

۲۹۔ اشفاق احمد، ''پوری جان کاری ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۷۵

۳۰۔ ایضاً، ص۷۸

۳۱۔ ایضاً، ص۷۹

۳۲۔ اشفاق احمد، ''پوری جان کاری ''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۸۰

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)

۳۳۔ اشفاق احمد، ''قلارے''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۸۷

۳۴۔ ایضاً، ص۹۵

۳۵۔ اشفاق احمد، ''بولتا بندر''مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۱۲۶

۳۶۔ ایضاً، ص۱۳۴

۳۷۔ اشفاق احمد، ''سلامتی کی مار''مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۳۵

۳۸۔ اشفاق احمد، ''ننگ ناموس''مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۸۸

۳۹۔ اشفاق احمد، ''بچھیری''مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۹۴

۴۰۔ اشفاق احمد، ''دوپہر ویلے''مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۹۹

۴۱۔ اشفاق احمد، ''بابا''مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۱۵۲

۴۲۔ اشفاق احمد، ''فل برائٹ''مشمولہ: ''سفر مینا''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۲۵۶

۴۳۔ اشفاق احمد، ''خود بدولت''مشمولہ: ''صبحانے فسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۳۵

۴۴۔ اشفاق احمد، ''ماسٹر روشی''مشمولہ: ''صبحانے فسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۱۰۴

۴۵۔ اشفاق احمد، ''شازیہ کی رخصتی''مشمولہ: ''صبحانے فسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۱۴۷

۴۶۔ ایضاً، ص۱۴۶9

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ایضاً، ص۱۸۴

۴۹۔ ایضاً، ص۱۸۵

۵۰۔ اشفاق احمد، ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا''مشمولہ: ''صبحانے فسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۲۲۳۱

۵۱۔ اشفاق احمد، ''سہیل کی سالگرہ''مشمولہ: ''صبحانے فسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص۲۷۶

۵۲۔ ایضا"ص۱۵۲

Copyright © 2023 Insights of Pakistan, Iran and the Caucasus Studies (IPICS)